نویں امام

حضرت امام محمد تقی علیہ السلام

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی النقوی طاب ثراہ

نام ونسب: محمد نام، ابوجعفر کنیت اور تقی وجواد دونوں مشہور لقب تھے۔ اسی لیے اسم ولقب کو شریک کر کے آپ امام محمد تقی علیہ السلام کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ چونکہ آپ کے پہلے امام محمد باقر علیہ السلام کی کنیت ابوجعفر ہو چکی تھی اس لیے کتابوں میں آپ کو ابوجعفر ثانی اور دوسرے لقب کو سامنے رکھ کر حضرت جواد بھی کہا جاتا ہے۔ والد بزرگوار آپ کے حضرت امام رضاؑ تھے اور والدۂ معظّمہ کا نام جناب سبیکہ یا سکینہ تھا۔

ولادت: ۱۰ ؍رجب ۱۹۵ھ کو مدینہ منورہ میں ولادت ہوئی۔ اس وقت بغداد کے دار السلطنت میں ہارون رشید کا بیٹا امین تخت حکومت پر تھا۔

نشوونما اور تربیت: یہ ایک حسرتناک واقعہ ہے کہ امام محمد تقی علیہ السلام کو نہایت کمسنی ہی کے زمانے میں مصائب اور پریشانیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوجانا پڑا۔ انہیں بہت ہی کم اطمینان اور سکون کے لمحات باپ کی محبت، شفقت اور تربیت کے سایے میں زندگی گذارنے کا موقع مل سکا۔ آپ کو صرف پانچواں برس تھا جب حضرت امام رضا علیہ السلام مدینہ سے خراسان کی طرف سفر کرنے پر مجبور ہوئے۔ امام محمد تقی علیہ السلام اس وقت سے جو اپنے باپ سے جدا ہوئے تو پھر زندگی میں ملاقات کا موقع نہ ملا۔ امام محمد تقیؑ سے جدا ہونے کے تیسرے سال امام رضاؑ کی وفات ہوگئی۔ دنیا سمجھتی ہوگی کہ امام محمد تقیؑ کے لیے علمی اور عملی بلندیوں تک پہونچنے کا کوئی ذریعہ نہیں رہا اس لیے اب امام جعفر صادقؑ کی علمی مسند شاید خالی نظر آئے۔ مگر خلق خدا کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس کمسن بچے کو تھوڑے دن بعد مامون کے پہلو میں بیٹھکر بڑے بڑے علماء سے فقہ، حدیث، تفسیر اور کلام پر مناظرے کرتے اور سب کو قائل ہوجاتے دیکھا۔ ان کی حیرت اس وقت تک دور ہونا ممکن نہ تھی جب تک وہ مادی اسباب کے آگے ایک مخصوص خداوندی مدرسہ تعلیم وتربیت کے قائل نہ ہوتے جس کے بغیر یہ معمہ نہ حل ہوا اور نہ کبھی حل ہوسکتا ہے۔

عراق کا پہلا سفر: جب امام رضا علیہ السلام کو مامون نے ولی عہد بنایا اور اس کی سیاست اسکی مقتضی ہوئی کہ بنی عباس کو چھوڑ کر بنی فاطمہ سے روابط قائم کیے جائیں اور اس طرح شیعیان اہل بیتؑ کو اپنی جانب مائل کیا جائے تو اس نے ضرورت محسوس کی کہ خلوص واتحاد کے مظاہرے کے لیے علاوہ اس قدیم رشتے کے جو ہاشمی خاندان میں سے ہونے کی وجہ سے ہے کچھ جدید رشتوں کی بنیاد بھی قائم کردی جائے۔

چنانچہ اسی جلسہ میں جہاں ولی عہدی کی رسم ادا کی گئی اس نے اپنی بہن ام حبیبہ کا عقد امام رضاؑ کے ساتھ کیا اور اپنی بیٹی ام الفضل کی نسبت کا امام محمد تقیؑ کے ساتھ اعلان کیا۔ غالباً اس کا خیال تھا کہ اس طرح امام رضا بالکل اپنے بنائے جاسکیں گے ۔مگر جب اس نے محسوس کیا کہ یہ اپنے ان منصبی فرائض کو جو رسولؐ کے ورثہ دار ہونے کی بنا پر ان کے ذمہ ہیں کسی قیمت پر چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوسکتے اور اب عباسی سلطنت کا رکن ہونے کے ساتھ ان اصول پر قائم رہنا مدینہ کے محلہ بنی ہاشم میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے سے کہیں زیادہ خطرناک ہے تو اسے اپنے مفاد سلطنت کے تحفظ کی خاطر اس کی ضرورت ہوئی کہ وہ زہر دے کر حضرت کی زندگی کا خاتمہ کردے ۔مگر وہ مصلحت جو امام رضاؑ کو ولی عہد بنانے کی تھی یعنی ایرانی قوم اور جماعت شیعہ کو اپنے قبضہ میں رکھنا وہ اب بھی باقی تھی اس لیے ایک طرف تو امام رضاؑ کے انتقال پر اس نے غیر معمولی رنج وغم کا اظہار کیا تا کہ وہ اپنے دامن کو حضرت کے خون ناحق سے الگ ثابت کر سکے اور دوسری طرف اس نے اپنے اس اعلان کی تکمیل ضروری سمجھی جو وہ امام محمد تقیؑ کے ساتھ اپنی لڑکی کے منسوب کرنے کا کر چکا تھا۔ اس نے اس مقصد سے امام محمد تقیؑ کو مدینہ سے عراق کی طرف بلوایا اس لیے کہ امام رضاؑ کی وفات کے بعد وہ خود خراسان سے اب اپنے خاندان کے پرانے دارالسلطنت بغداد میں آ چکا تھا اور اس نے یہ تہیہ کرلیا کہ وہ ام الفضل کا عقد اس صاحبزادے کے ساتھ بہت جلد کردے۔

علماء سے مناظرہ: بنی عباس کو مامون کی طرف سے امام رضاؑ کا ولی عہد بنایا جانا ہی ناقابل برداشت تھا۔ امام رضاؑ کی وفات سے ایک حد تک انہیں اطمینان حاصل ہوا تھا اور انہوں نے مامون سے اپنے حسب دلخواہ اس کے بھائی موتمن کی ولی عہدی کا اعلان بھی کرا دیا جو بعد میں معتصم باللہ کے نام سے خلیفہ تسلیم کیا گیا۔ اس کے علاوہ امام رضاؑ کی ولی عہدی کے زمانے میں عباسیوں کا مخصوص شعار یعنی کالا لباس ترک ہو کر جو سبز لباس کا رواج ہو رہا تھا اسے منسوخ کر کے پھر سیاہ لباس کی پابندی عائد کردی گئی تا کہ بنی عباس کے روایات قدیمہ محفوظ رہیں۔ یہ سب باتیں عباسیوں کو یقین دلا رہی تھیں کہ وہ مامون پر پورا قابو پا چکے ہیں مگر اب مامون کا یہ ارادہ کہ وہ امام محمد تقیؑ کو اپنا داماد بنائے ان لوگوں کے لیے پھر تشویش کا باعث بنا۔ اس حد تک کہ وہ اپنے دلی رجحان کو دل میں نہ رکھ سکے اور ایک وفد کی شکل میں مامون کے پاس آ کر اپنے جذبات کا اظہار کر دیا۔ انہوں نے صاف صاف کہا کہ امام رضاؑ کے ساتھ جو آپ نے طریقہ کار اختیار کیا وہی ہم کو ناپسند تھا مگر خیر وہ کم از کم اپنی عمر واوصاف وکمالات کے لحاظ سے قابل عزت سمجھے بھی جاسکتے تھے مگر یہ ان کے بیٹے محمدؑ تو ابھی بالکل کم سن ہیں ایک بچے کو بڑے بڑے علماء اور معززین پر ترجیح دینا اور اس قدر اس کی عزت کرنا خلیفہ کے لیے زیبا نہیں ہے۔ پھر ام حبیبہ کا نکاح جو امام رضاؑ کے ساتھ کیا گیا تھا اس سے ہم کو کیا فائدہ پہونچا جو اب ام الفضل کا نکاح بھی محمد ابن علیؑ کے ساتھ کیا جارہا ہے۔

مامون نے اس تمام تقریر کا یہ جواب دیا کہ محمد کمسن ضرور ہیں مگر میں نے خوب اندازہ کرلیا ہے کہ اوصاف

وکمالات میں وہ اپنے باپ کے پورے جانشین ہیں اور عالم اسلام کے بڑے بڑے علماء جن کا تم حوالہ دے رہے ہو علم میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اگر تم چاہو تو امتحان لے کر دیکھ لو۔ پھر تمہیں بھی میرے فیصلے سے متفق ہونا پڑے گا۔ یہ صرف منصفانہ جواب ہی نہیں بلکہ ایک طرح کا چیلنج تھا جس پر مجبوراً ان لوگوں کو مناظرے کی دعوت منظور کرنا پڑی حالانکہ خود مامون تمام سلاطین بنی عباس میں یہ خصوصیت رکھتا ہے کہ مورخین اس کے لیے یہ الفاظ لکھ دیتے ہیں **کان یعد من کبار الفقھاء** یعنی اس کا شمار بڑے فقیہوں میں ہے۔ اس لیے اس کا فیصلہ کچھ کم وقعت نہ رکھتا تھا مگر ان لوگوں نے اس پر اکتفا نہیں کی بلکہ بغداد کے سب سے بڑے عالم یحییٰ ابن اکثم کو امام محمد تقی علیہ السلام سے بحث کے لیے منتخب کیا۔

مامون نے ایک عظیم الشان جلسہ اس مناظرے کے لیے منعقد کیا اور عام اعلان کروا دیا۔ ہر شخص اس عجیب اور بظاہر غیر متوازی مقابلے کے دیکھنے کا مشتاق ہو گیا جس میں ایک طرف ایک آٹھ برس کا بچہ تھا اور دوسری طرف ایک آزمودہ کار اور شہرۂ آفاق قاضی القضاۃ۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ہر طرف سے خلائق کا ہجوم ہو گیا تھا۔ مورخین کا بیان ہے کہ ارکان دولت اور معززین کے علاوہ اس جلسے میں نو سو کرسیاں فقط علماء و فضلاء کے لیے مخصوص تھیں اور اس میں کوئی تعجب بھی نہیں اس لیے کہ یہ زمانہ عباسی سلطنت کے شباب اور بالخصوص علمی ترقی کے اعتبار سے زرّین دور تھا اور بغداد دارالسلطنت تھا جہاں تمام اطراف سے مختلف علوم وفنون کے ماہرین کھنچ کر جمع ہو گئے تھے اس اعتبار سے یہ تعداد کسی مبالغہ پر مبنی معلوم نہیں ہوتی۔

مامون نے حضرت امام محمد تقیؑ کے لیے اپنے پہلو میں مسند بچھوائی تھی اور حضرت کے سامنے یحییٰ ابن اکثم کے لیے بیٹھنے کی جگہ تھی ہر طرف کامل سناٹا تھا۔ مجمع ہمہ تن چشم و گوش بنا ہوا گفتگو شروع ہونے کے وقت کا منتظر ہی تھا کہ اس خاموشی کو یحییٰ کے اس سوال نے توڑ دیا جو اس نے مامون کی طرف مخاطب ہو کر کیا تھا ''حضور کیا مجھے اجازت ہے کہ میں ابوجعفرؑ سے کوئی مسئلہ دریافت کروں۔''

مامون نے کہا ''تم کو خود ان سے اجازت طلب کرنا چاہیئے۔''

یحییٰ امام کی طرف متوجہ ہوا اور کہا ''کیا آپ اجازت دیتے ہیں کہ میں آپ سے کچھ دریافت کروں؟''

فرمایا ''تم جو پوچھنا چاہو پوچھ سکتے ہو۔''

یحییٰ نے پوچھا کہ ''حالت احرام میں اگر کوئی شخص شکار کرتے تو اس کا کیا حکم ہے؟ اس سوال سے اندازہ ہوتا ہے کہ یحییٰ حضرت امام محمد تقیؑ کی علمی بلندی سے بالکل واقف نہ تھا۔ وہ اپنے غرور علم اور جہالت سے یہ سمجھتا تھا کہ یہ کم سن صاحبزادے تو ہیں ہی روزمرہ کے روزے نماز کے مسائل سے واقف ہوں تو ہوں مگر حج وغیرہ کے احکام اور حالت احرام میں جن چیزوں کی ممانعت ہے ان کے کفاروں سے بھلا کہاں واقف ہوں گے۔

امامؑ نے اس کے جواب میں اس طرح سوال کے گوشوں کی الگ الگ تحلیل فرمائی جس سے بغیر کوئی جواب

اصل مسئلے کا دیئے ہوئے آپ کے علم کی گہرائیوں کا یحییٰ اور تمام اہل محفل کو اندازہ ہو گیا۔ یحییٰ خود بھی اپنے کو سبک پانے لگا اور تمام مجمع بھی اس کا سبک ہونا محسوس کرنے لگا۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ تمہارا سوال بالکل مبہم اور مجمل ہے۔ یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ شکار حل میں تھا یا حرم میں؟ شکار کرنے والا مسئلے سے واقف تھا یا ناواقف؟ اس نے عمداً اس جانور کو مار ڈالا یا دھوکے سے قتل ہو گیا؟ وہ شخص آزاد تھا یا غلام؟ کمسن تھا یا بالغ؟ پہلی مرتبہ ایسا کیا تھا یا اس کے پہلے بھی ایسا کر چکا تھا؟ شکار پرندہ کا تھا یا کوئی اور؟ چھوٹا تھا یا بڑا؟ وہ اپنے فعل پر اصرار رکھتا ہے یا پشیمان ہے؟ رات کو یا پوشیدہ طریقہ پر اس نے شکار کیا یا دن دہاڑے اور علانیہ؟ احرام عمرہ کا تھا یا حج کا؟ جب تک یہ تمام تفصیلات نہ بتائے جائیں اس مسئلے کا کوئی ایک معین حکم نہیں بتایا جا سکتا۔

یحییٰ کتنا ہی ناقص کیوں نہ ہوتا بہرحال فقہی مسائل پر کچھ نہ کچھ اس کی نظر بھی تھی وہ ان کثیر التعداد شقوں کے پیدا کرنے ہی سے خوب سمجھ گیا کہ ان کا مقابلہ میرے لیے آسان نہیں ہے۔ اس کے چہرے پر ایسی شکستگی کے آثار پیدا ہوئے جن کا تمام دیکھنے والوں نے اندازہ کر لیا۔ اب اس کی زبان خاموش تھی اور وہ کچھ جواب نہ دیتا تھا۔ مامون نے اس کی کیفیت کا صحیح اندازہ کر کے اس سے کچھ کہنا بیکار سمجھا اور حضرت سے عرض کیا کہ پھر آپ ہی ان تمام شقوں کے احکام بیان فرما دیجیے تا کہ ہم سب کو استفادہ کا موقع مل سکے۔ امام نے تفصیل کے ساتھ تمام صورتوں کے جداگانہ جو احکام تھے بیان فرمائے۔ یحییٰ ہکا بکا امام کا منہ دیکھ رہا تھا اور بالکل خاموش تھا۔ مامون کو بھی کد تھی کہ وہ اتمام حجت کو انتہائی درجے تک پہونچا دے۔ اس لیے اس نے امام سے عرض کیا کہ ''اگر مناسب معلوم ہو تو آپ بھی یحییٰ سے کوئی سوال فرمائیں۔'' حضرت نے اخلاقاً یحییٰ سے دریافت فرمایا کہ ''کیا میں بھی تم سے کچھ پوچھ سکتا ہوں'' یحییٰ اب اپنے متعلق کسی دھوکے میں مبتلا نہ تھا۔ اپنا اور امام کا درجہ اسے خوب معلوم ہو چکا تھا اس لیے طرز گفتگو اس کا اب دوسرا ہی تھا۔ اس نے کہا کہ ''حضور دریافت فرمائیں اگر مجھے معلوم ہو گا تو عرض کر دوں گا ورنہ خود حضور ہی سے معلوم کر لوں گا'' حضرت نے سوال کیا جس کے جواب میں یحییٰ نے کھلے لفظوں میں اپنی عاجزی کا اقرار کیا اور پھر امامؑ نے خود اس سوال کو حل فرما دیا۔ مامون کو اپنی بات کے بالا رہنے کی خوشی تھی۔ اس نے مجمع کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ:۔

''دیکھو میں نہ کہتا تھا کہ یہ وہ گھرانا ہے جو قدرت کی طرف سے علم کا مالک قرار دیا گیا ہے۔ یہاں کے بچوں کا بھی کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔'' مجمع میں جوش و خروش تھا سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ بیشک جو آپ کی رائے ہے وہ بالکل ٹھیک ہے اور یقینا ابوجعفر محمد ابن علیؑ کا کوئی مثل نہیں ہے۔ مامون نے اس کے بعد ذرا بھی تاخیر مناسب نہیں سمجھی اور اسی جلسے میں امام محمد تقی علیہ السلام کے ساتھ ام الفضل کا عقد کر دیا۔ نکاح کے قبل جو خطبہ ہمارے یہاں عموماً پڑھا جاتا ہے وہی ہے جو کہ امام محمد تقیؑ نے اس عقد کے موقع پر اپنی زبان مبارک پر جاری کیا تھا۔ یہی بطور یادگار نکاح کے موقع پر باقی رکھا گیا ہے۔ مامون نے اس شادی کی خوشی میں بڑی

فیاضی سے کام لیا، لاکھوں روپیہ خیر و خیرات میں تقسیم کیا گیا اور تمام رعایا کو انعامات و عطایا کے ساتھ مالا مال کیا گیا۔

مدینہ کی طرف واپسی: شادی کے بعد تقریباً ایک سال تک امام محمد تقیؑ بغداد میں مقیم رہے اس کے بعد مامون نے بہت اہتمام کے ساتھ ام الفضل کو حضرت کے ساتھ رخصت کر دیا اور امام مدینہ میں واپس تشریف لائے۔

اخلاق و اوصاف: امام محمد تقیؑ اخلاق و اوصاف میں انسانیت کی اس بلندی پر تھے جس کی تکمیل رسولؐ اور آل رسولؐ کا طرۂ امتیاز تھی۔ ہر ایک سے جھک کر ملنا، ضرورت مندوں کی حاجت روائی کرنا، مساوات اور سادگی کو ہر حال میں پیش نظر رکھنا، غرباء کی پوشیدہ طور پر خبر لینا، دوستوں کے علاوہ دشمنوں تک سے اچھا سلوک کرتے رہنا، مہمانوں کی خاطر داری میں انہاک اور علمی اور مذہبی پیاسوں کے لیے فیض کے چشموں کا جاری رکھنا آپ کی سیرت زندگی کا نمایاں پہلو تھا۔ بالکل ویسا ہی جیسے اس سلسلۂ عصمت کے دوسرے تمام افراد کا تھا۔

اہل دنیا جو آپ کی بلندی نفس کا پورا اندازہ نہ رکھتے تھے انہیں یہ تصور ضرور ہوتا تھا کہ ایک کمسن بچے کا عظیم الشان مسلمان سلطنت کے شہنشاہ کا داماد ہو جانا یقیناً اس کے چال ڈھال، طور طریقے بدل دے گا اور اس کی زندگی دوسرے سانچے میں ڈھل جائے گی۔ حقیقت میں یہ ایک بہت بڑا مقصد ہو سکتا ہے جو مامون کی کوتاہ نگاہ کے سامنے بھی تھا۔ بنی امیہ یا بنی عباس کے بادشاہوں کو آل رسولؐ کی ذات سے اتنا اختلاف نہ تھا جتنا ان کے صفات سے۔ وہ ہمیشہ اس کے در پے رہتے تھے کہ بلندی اخلاق اور معراج انسانیت کا وہ مرکز جو مدینہ میں قائم ہے اور جو سلطنت کے مادی اقتدار کے مقابلے میں ایک مثالی روحانیت کا مرکز بنا ہوا ہے، یہ کسی طرح ٹوٹ جائے۔ اسی کے لیے گھبرا گھبرا کر وہ مختلف تدبیریں کرتے تھے۔ امام حسینؑ سے بیعت طلب کرنا اسی کی ایک شکل تھی اور پھر امام رضاؑ کو ولیعہد بنانا اسی کا دوسرا طریقہ۔ فقط ظاہری شکل وصورت میں ایک کا انداز معاندانہ اور دوسرے کا طریقہ ارادت مندی کے روپ میں تھا۔ مگر اصل حقیقت دونوں صورتوں کی ایک تھی۔ جس طرح امام حسینؑ نے بیعت نہ کی تو وہ شہید کر ڈالے گئے اسی طرح امام رضاؑ ولیعہد ہونے کے باوجود حکومت کے مادی مقاصد کے ساتھ ساتھ نہ چل سکے تو آپ کو زہر کے ذریعے سے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا گیا۔

اب مامون کے نقطۂ نظر سے یہ موقع انتہائی قیمتی تھا کہ امام رضاؑ کا جانشین تقریباً آٹھ برس کا بچہ ہے جو تین برس پہلے ہی باپ سے چھڑا لیا جا چکا تھا۔ حکومت وقت کی سیاسی سوجھ بوجھ کہہ رہی تھی کہ اس بچے کو اپنے طریقے پر لانا نہایت آسان ہے اور اس کے بعد وہ مرکز جو حکومت وقت کے خلاف ساکن اور خاموش مگر انتہائی خطرناک، قائم ہے ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔

مامون امام رضاؑ کے ولیعہدی کی مہم میں اپنی ناکامی کو مایوسی کا سبب نہیں تصور کرتا تھا۔ اس لیے کہ امام رضاؑ کی زندگی ایک اصول پر قائم رہ چکی تھی۔ اس میں تبدیلی اگر نہیں ہوئی تو یہ ضروری نہیں کہ امام محمد تقیؑ جو آٹھ برس کے سن

سے قصر حکومت میں نشوونما پا کر بڑھیں وہ بھی بالکل اپنے بزرگوں کے اصول زندگی پر برقرار رہیں۔

سوا ان لوگوں کے جو ان مخصوص افراد کے خداداد کمالات کو جانتے تھے اس وقت کا ہر شخص یقیناً مامون ہی کا ہم خیال ہوگا۔ مگر دنیا کو حیرت ہوگئی جب یہ دیکھا کہ وہ آٹھ برس کا بچہ جسے شہنشاہ اسلام کا داماد بنادیا گیا ہے اس عمر میں اپنے خاندانی رکھ رکھاؤ اور اصول کا اتنا پابند ہے کہ وہ شادی کے بعد محل شاہی میں قیام سے انکار کردیتا ہے اور اس وقت بھی کہ جب بغداد میں قیام رہتا ہے تو ایک علیٰحدہ مکان بکرایہ لے کر اس میں قیام فرماتے ہیں۔ اس سے بھی امام کی مستحکم قوت ارادی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ عموماً مالی اعتبار سے لڑکی والے کچھ بھی بڑا درجہ رکھتے ہوتے ہیں تو وہ یہ پسند کرتے ہیں کہ جہاں وہ رہیں وہیں داماد بھی رہے۔ اس گھر میں نہ سہی تو کم از کم اسی شہر میں قیام رہے۔ مگر امام محمد تقیؑ نے شادی کے ایک سال بعد ہی مامون کو حجاز واپس جانے کی اجازت پر مجبور کردیا۔ یقیناً یہ امر ایک چاہنے والے باپ اور مامون ایسے بااقتدار کے لیے انتہائی ناگوار تھا مگر اسے لڑکی کی جدائی گوارا کرنا پڑی اور امام مع ام الفضل کے مدینہ تشریف لے گئے۔

مدینہ میں تشریف لانے کے بعد ڈیوڑھی کا وہی انداز رہا جو اس کے پہلے تھا۔ نہ پہریدار نہ کوئی خاص روک ٹوک، نہ تزک واحتشام نہ اوقات ملاقات، نہ ملاقاتیوں کے ساتھ برتاؤں میں کوئی تفریق۔ زیادہ تر نشست مسجد نبویؐ میں رہتی تھی جہاں مسلمان حضرت کے وعظ ونصیحت سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ راویان حدیث احادیث دریافت کرتے تھے، طلاب علم مسائل پوچھتے تھے، صاف ظاہر تھا کہ جعفر صادقؑ ہی کا جانشین ہے جو اسی مسند علم پر بیٹھا ہوا ہدایت کا کام انجام دے رہا ہے۔

امور خانہ داری اور ازدواجی زندگی میں آپ کے بزرگوں نے اپنی بیویوں کو جن حدود میں رکھا تھا ان ہی حدود میں آپ نے ام الفضل کو بھی رکھا۔ آپ نے اس کی مطلق پرواہ نہ کی کہ آپ کی بیوی ایک شہنشاہ وقت کی بیٹی ہیں۔ چنانچہ ام الفضل کے ہوتے ہوئے آپ نے حضرت عمار یاسر کی نسل سے ایک محترم خاتون کے ساتھ عقد بھی فرمایا اور قدرت کو نسل امامت اسی خاتون سے باقی رکھنا منظور تھی۔ یہی امام علی نقیؑ کی ماں ہوئیں۔ ام الفضل نے اس کی شکایت اپنے باپ کے پاس لکھ کر بھیجی۔ مامون کے دل کے لیے بھی یہ کچھ کم تکلیف دہ امر نہ تھا مگر اسے اب اپنے کیے کو نباہنا تھا، اس نے ام الفضل کو جواب لکھا کہ تمہارا عقد ابوجعفرؑ کے ساتھ اس لیے نہیں کیا ہے کہ ان پر کسی حلال خدا کو حرام کر دوں۔ مجھ سے اب اس قسم کی شکایت نہ کرنا۔

یہ جواب دے کر حقیقت میں اس نے اپنی خفت مٹائی ہے۔ ہمارے سامنے اس کی نظیریں موجود ہیں کہ اگر مذہبی حیثیت سے کوئی بااحترام خاتون ہوئی ہے تو اس کی زندگی میں کسی دوسری بیوی سے نکاح نہیں کیا گیا۔ جیسے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے جناب خدیجہ اور حضرت علی مرتضیٰؑ کے لیے جناب فاطمہ زہراؑ۔ مگر شہنشاہ دنیا کی بیٹی کو یہ امتیاز دینا صرف اس لیے کہ وہ ایک بادشاہ کی بیٹی

ہے، اسلام کی اس روح کے خلاف تھا جس کے آلِ محمدؐ محافظ تھے۔ اس لیے امام محمد تقیؑ نے اس کے خلاف طرزِ عمل اختیار کرنا اپنا فریضہ سمجھا۔

تبلیغ وہدایت: آپ کی تقریر بہت دلکش اور پر تاثیر ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ زمانہ حج میں مکہ معظّمہ میں مسلمانوں کے مجمع میں کھڑے ہوکر آپ نے احکام شرع کی تبلیغ فرمائی تو بڑے بڑے علماء دم بخود اور دنگ رہ گئے اور انہیں اقرار کرنا پڑا کہ ہم نے ایسی جامع تقریر کبھی نہیں سنی۔

امام رضاؑ کے زمانہ میں ایک گروہ پیدا ہوگیا تھا جو امام موسیٰ کاظمؑ پر توقف کرتا تھا یعنی آپ کے بعد امام رضا علیہ السلام کی امامت کا قائل نہیں تھا اور اس لیے واقفیہ کہلاتا تھا۔ امام محمد تقیؑ نے اپنے دور میں اس گروہ میں ایسی کامیاب تبلیغ فرمائی کہ سب اپنے عقیدے سے تائب ہوگئے اور آپ کے زمانہ ہی میں کوئی ایک شخص ایسا باقی نہ رہ گیا جو اس مسلک کا حامی ہو۔

بہت سے بزرگ مرتبہ علماء نے آپ سے علوم اہلبیتؑ کی تعلیم حاصل کی۔ آپ کے ایسے مختصر حکیمانہ مقولوں کا بھی ایک ذخیرہ ہے جیسے آپ کے جد بزرگوار حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ کے کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ جناب امیر علیہ السلام کے بعد امام محمد تقیؑ کے مقولوں کو ایک خاص درجہ حاصل ہے۔ الٰہیات اور توحید کے متعلق آپ کے بعض بلند پایہ خطبے بھی موجود ہیں۔

عراق کا آخری سفر: ۲۱۸ھ میں مامون نے دنیا کو خیر باد کہا۔ اب مامون کا بھائی اور ام الفضل کا چچا مؤتمن جو امام رضاؑ کے بعد ولی عہد بنایا جاچکا تھا تخت سلطنت پر بیٹھا اور معتصم باللہ عباسی کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کے بیٹھتے ہی امام محمد تقیؑ سے متعلق ام الفضل کے اسی طرح کے شکایتی خطوط کی رفتار بڑھ گئی جس طرح کے اس نے اپنے باپ مامون کو بھیجے تھے۔ مامون نے چونکہ تمام بنی عباس کی مخالفتوں کے بعد بھی اپنی لڑکی کا نکاح امام محمد تقی علیہ السلام کے ساتھ کردیا تھا اس لیے اپنی بات کی پچ اور کیے کی لاج رکھنے کی خاطر اس نے ان شکایتوں پر کوئی خاص توجہ نہیں کی بلکہ مایوس کردینے والے جواب سے بیٹی کی زبان بند کردی تھی مگر معتصم کو جو امام رضاؑ کی ولی عہدی کا داغ اپنے سینہ پر اٹھائے ہوئے تھا اور امام محمد تقیؑ کو داماد بنائے جانے سے تمام بنی عباس کے نمایندے کی حیثیت سے پہلے ہی اختلاف کرنے والوں میں پیش پیش رہ چکا تھا۔ اب ام الفضل کے شکایتی خطوں کو اہمیت دے کر اپنے اس اختلاف کو جو اس نکاح سے تھا حق بجانب ثابت کرنا تھا۔ پھر سب سے زیادہ امام محمد تقیؑ کی علمی مرجعیت، آپ کے اخلاقی اثر کا شہرہ جو حجاز سے بڑھ کر عراق تک پہونچا ہوا تھا، وہ بنائے مخاصمت جو معتصم کے بزرگوں کو امام محمد تقیؑ کے بزرگوں سے رہ چکی تھی، اور پھر اس سیاست کی ناکامی اور منصوبے کی شکست کا محسوس ہوجانا جو اس عقد کا محرک ہوا تھا جس کی تشریح پہلے ہوچکی ہے یہ تمام باتیں تھیں کہ معتصم مخالفت کے لیے آمادہ ہوگیا۔ اپنی سلطنت کے دوسرے ہی سال امام محمد تقیؑ کو مدینہ سے بغداد کی طرف بلوا بھیجا، حاکم مدینہ عبدالملک کو اس بارے میں تاکیدی خط لکھا۔ مجبوراً امام محمد تقیؑ اپنے فرزند امام علی نقیؑ اور ان

بقیہ صفحہ ۳۵ پر

شیر خدا حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کی تلوار مشہور سردار عمرو بن عبدود کے سر پر لگ چکی ہے اور وہ زمین پر تڑپ رہا ہے آپ اس دشمن خدا کے سینے پر پہنچے اور سر کاٹنا چاہا۔ اسی حالت میں عمرو نے آپ کے چہرۂ مبارک کی طرف تھوک کر بے ادبی کی حضرت امیر المومنین علیؑ فوراً اس کے سینہ پر سے اتر آئے اور جب غصہ کم ہوا تو پھر آگے بڑھے اور اس کا سر جدا فرمایا۔ جب جنگ ختم ہو چکی تو کسی نے سوال کیا کہ آپ نے دشمن کو قابو میں لا کے کیوں چھوڑ دیا تھا۔ تو آپ نے فرمایا کہ جب اس نے میری طرف تھوکا تھا تو مجھے غصہ آ گیا تھا اس کی اس حرکت پر اس لیے میں اس کے سینہ پر سے اتر آیا کہ کہیں ایسا نہ ہو میری اس خدمت دینی میں میرا ذاتی جذبۂ انتقام شریک ہو جائے اور جب وہ غصہ فرو ہو گیا تو میں نے اس کا سر جدا کر دیا۔ اسلام کی ہمارے لیے یہ تعلیم ہے کہ ہم کسی وقت بھی اپنے فرض کے احساس میں نفسانی جذبات کی آمیزش نہ ہونے دیں اور جو کچھ بھی کریں وہ وہی جس کی خدا نے اجازت دی ہو۔

اسلامی تاریخ شجاعت و بہادری کے کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ ہمارے بہادر اسلاف کے نام انسانی حافظہ سے کبھی مٹ نہیں سکتے۔ ہمارے پاس سب سے بڑا اسلحہ ہماری تاریخ ہے اور ہمارے بزرگوں کے کارنامے ہیں جو ہماری رگ حیات میں شجاعت کے ولولے پیدا کرتے رہیں گے اور ان میں کبھی نہ مٹنے والی روح بہادری پھونکتے رہیں گے اور یہ وہ تاریخ کی قدریں ہیں جو ہمارے بچہ بچہ کے ذہن میں ثبت ہیں۔

بقیہ امام محمد تقی علیہ السلام

کی والدہ کو مدینہ میں چھوڑ کر بغداد کی طرف روانہ ہوئے۔

وفات: بغداد میں تشریف لانے کے بعد تقریباً ایک سال تک معتصم نے بظاہر آپ کے ساتھ کوئی سختی نہیں کی مگر آپ کا یہاں قیام خود ہی ایک جبری حیثیت رکھتا تھا جسے نظر بندی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد اسی خاموش حربے سے جو اکثر اس خاندان کے بزرگوں کے خلاف استعمال کیا جا چکا تھا آپ کی زندگی کا خاتمہ کر دیا گیا اور ۲۹/ذی القعدہ ۲۲۰ھ میں زہر سے آپ کی شہادت ہوئی اور اپنے جد بزرگوار حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کے پاس دفن ہوئے۔ آپ ہی کی شرکت کا لحاظ کر کے عربی قاعدے سے اس شہر کا نام کاظمین (دو کاظم یعنی غصہ کو ضبط کرنے والے) مشہور ہوا ہے۔ اس میں حضرت موسیٰ کاظمؑ کے لقب کو صراحۃً سامنے رکھا گیا جبکہ موجودہ زمانے میں اسٹیشن کا نام جوادین (دو جواد المعنی فیاض) درج ہے جس میں صراحۃً حضرت امام محمد تقیؑ کے لقب کو ظاہر کیا جا رہا ہے چونکہ آپ کا لقب تقی بھی تھا اور جواد بھی۔

رضوی سید: یہ ایک حقیقت ہے کہ جتنے سادات رضوی کہلاتے ہیں وہ دراصل تقوی ہیں یعنی حضرت امام محمد تقیؑ کی اولاد ہیں۔ اگر حضرت امام رضاؑ کی اولاد امام محمد تقیؑ کے علاوہ کسی اور فرزند کے ذریعے سے بھی ہوتی تو امتیاز کے لیے وہ اپنے کو رضوی کہتی اور امام محمد تقیؑ کی اولاد اپنے کو تقوی کہتی، مگر چونکہ امام رضاؑ کی نسل صرف امام محمد تقیؑ سے چلی اور حضرت امام رضاؑ کی شخصی شہرت سلطنت عباسیہ کے ولی عہد ہونے کی وجہ سے جمہور مسلمین میں بہت ہو چکی تھی اس لیے تمام اولاد کا حضرت امام رضاؑ کی طرف منسوب کر کے تعارف کیا جانے لگا اور رضوی کے نام سے مشہور ہوئے۔